ذریعہ ارادۂ الٰہی کی تکمیل ہوئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ قوانین قدرت ہی ہیں، جذب وتحلیل ہوکر اور یہی وہ چیز ہے جس نے غیر ترقی یافتہ شعورِ ذہنی کو ہمیشہ مغالطہ میں مبتلا کیا اور آیات ومعجزات کو مستحق تضحیک قرار دیا ہے۔ قوانین کے تحت کسی معجزہ کا صدور اُس کو آیاتِ الٰہی کی فہرست سے خارج نہیں کرتا۔ قانونِ قدرت کے تحت معجزات اور آیات کا عدم امکان فرض کرلینا قدرتِ مطلقہ کو ضعف واضمحلال سے آلودہ کردیگا۔ نہ بعض مذہبی محققین کا یہ نظریہ درست ہے کہ معجزہ کے لیے خرقِ عادت ہونا ضروری ہے نہ مادہ پرستوں کا یہ خیال وقیع کہ قوانینِ فطرت میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔ تغیر نہ ہوسکنا تو رہا ایک طرف ایک لمحہ میں قوانینِ فطرت کا تمام دفتر غرقِ مے ناب کیا جاسکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ہر معجزہ کو قوانینِ فطرت کا ترجمان اور اُن کے رازہائے سربستہ کا منکشف بھی کہہ سکتے ہیں۔ معجزہ انسانی قوتوں سے بالاتر ہوتا ہے نہ کہ خارقِ عادت۔ دونوں نظریات میں کچھ نہ کچھ صداقت بھی ہے اور کچھ نہ کچھ مغالطہ بھی۔

میں نے جو کچھ عرض کیا، یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کا اعتراف اکابرِ اسلام اور علماء محققین کو نہ ہو مگر چونکہ مجھے ایک دوسرے موضوع پر خیالات پیش کرنا ہیں، اس لیے ضمنی مباحث پر سیر حاصل بحث کرنے سے معذور رہوں۔

آج جس عذابِ الٰہی کو قانونِ فطرت کا ایک جز بناتے ہوئے روایات یا بالفاظ صحیح تر "تاویلات" کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا چاہتا ہوں وہ قرآن کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:-

فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ۔

پھر ہم نے اُن سے کہا کہ شرف ورحمت سے دور اور ذلیل ہوتے ہوئے بندر ہوجاؤ۔ پھر ہم نے اُن کو درس عبرت بنادیا سامنے والوں اور اُن لوگوں کے لیے جو پیچھے ہیں، اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت۔

لیکن مسخ اور تحویل پر بحث کا آغاز کرنے سے پیشتر ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے اس اعتقاد، اذعان اور یقین کو ظاہر کردوں کہ ہرگونہ مسخ معنوی ہو یا صوری میرے نزدیک ممکن ہے اور قوانین فطرت ہی کے تحت ممکن ہے۔ اگر آپ نے کبھی نفسیاتی حقائق کی جسمانی اثر اندازیوں کا علمی مطالعہ یا مشاہدہ فرمایا ہوگا تو آپ ہرگز مسخ کے ایک زندہ امکان سے انکار نہیں کرسکتے۔ ڈاکو کے چہرے، بادشاہ کے چہرے، صوفی کے چہرے اور مسرت وغم کے تأثراتِ عضوی سے آپ کیونکر اصل حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں، اگرگوناگوں جذبات، اخلاقی ظلمت و پاکیزگی اور حرکت وعمل کا ہر نقش انسان کی جسمانی ساخت اور اُس کے قوائے باطنہ پر مرتسم ہوکر اُس کو اپنے رنگ میں نہیں رنگ لیتا۔ ایک پولس کانسٹبل چور کو، ایک پاک نفس بدمعاش کو، اور ایک معمولی انسان بدمعاش کو کیسے پہچان لیتا ہے؟ اخلاقیات میں یہ مسئلہ طے ہوچکا ہے کہ اخلاقی حُسن وقبح حواس اور ہیکل انسانی پر بغیر محسوس اثر ڈالے نہیں رہتا، اگر تسکین قلب کے لیے آپ مزید تفصیلات دیکھنا چاہتے ہوں تو کم ازکم مغربی محققین ہی کی تصنیفات دیکھیے، آپ کو اس نظریہ کی واقعیت کا یقین ہوجائیگا۔ خود میں نے بھی تین ۳ آدمیوں کو بالکل بندر کی صورت دیکھا ہے۔ غالباً خُبث نفس کا اثر ہوگا ورنہ ضعف ونقاہت اور بیماریاں تو صدہا حضرات کو لاحق ہوتی ہیں۔ بہرحال اگر خبث باطن اور تأثر نفسی جسمانی ساخت میں تغیر اور محسوس تغیر کرسکتا ہے، اور وہ بھی بعض اوقات حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ جیسا کہ غیر متوقع اور سراپا اذیت حوادثاتِ غم پر بال تک سفید ہوجاتے اور بڑھاپا چھا جاتا ہے، تو کیا کسی قوم کا شدید ترین خبث باطن، اخلاقی پستی، اور شہوت پرستی مسخ وتحویل کا باعث نہیں ہوسکتی اور خصوصاً جبکہ ایک پیغمبر کی بددعا قوت متخیلہ کی بے پناہ استعدادات کے ذریعہ انقلاب وتغیر کا طوفان برپا کردینے پر ہمہ تن آمادہ ہو حقیقت یہ ہے کہ قوتِ متخیلہ اور قوت ارادیہ قدرت کا ایک ایسا "پاور ہاؤس" ہے جو اگر تمام اضمحلالات سے بالاتر ہوجائے تو ساری کائنات میں انقلاب کے شعلے بلند کرسکتا ہے، جن حضرات نے قوت متخیلہ کی ایجابی اور فاعلانہ استعدادات پر ریسرچ نہیں

کی وہ انکار و تذبذب کی پُر پیچ وادیوں میں گم ہوسکتے ہیں، ورنہ قوت متخیلہ کی عام انسانی استعدادات اور خصوصاً موہبت الٰہیہ سے ممتاز قوتِ متخیلہ ہر وہ جادو، ہر وہ معجزہ، ہر وہ انقلاب کرسکتی ہے جس کا تصور بھی ہر شخص نہیں کرسکتا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ میں روایات سے متاثر ہو کر اس تکوینی مسخ کو اس ہی معنی میں لیتا ہوں بلکہ میرا مدعا صرف یہ تھا کہ اگر ایسا ہی ہوا ہو تو قرآن کے منشا سے محض اس لیے انکار یا تاویل و تذبذب کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ عام شعورِ ذہنی کے لیے یہ چیز کسی حد تک قابل قبول نہ تھی۔ اس کائنات کی وسعتوں میں کتنے طبیعاتی، اخلاقی، نفسیاتی، اور ریاضی و نجوم کے دقیق مسائل ہیں جو عالم انسانی کے ایک بڑے طبقہ کی عقل و دانش سے ہمیشہ بالاتر رہینگے۔ کیا آئن سٹائن کے "نظریۂ اضافیت" کے متعلق آپ نے نہیں سُنا کہ دنیا بھر میں اُس کے سمجھنے والے بارہ آدمیوں سے زیادہ نہیں، کیا ایک شعبدہ باز کے کرتب، ایک مسمریزم کے کرشمے، ایک ڈاکٹر کے نازک اعمالِ جراحی، ایک طبیب کی پیچیدہ تشخیص، ایک، ایک سائنس داں کی ایسی ایجادات جن کا جواب نہ ہو، ایک لیڈر یا ڈکٹیٹر کا نفسیات اِجتماعی اور بین الاقوامی حالات کا صحیح اندازہ کر کے اقتدار میں اضافہ کرسکنا، قدیم تمدن کے اہرام مصری اور اُن کی ممیاں، ایک نجومی کا زائچہ اور ایک صوفی کی کرامات کیا ان حقائق کی تہ تک کروڑوں انسان پہنچ سکتے ہیں؟۔ نہیں۔ پھر کیا محض اپنے شعوری اضمحلال کے تحت ہمیں ان تمام حقائق سے انکار کردینا چاہیے، غلط اور کس قدر!

سیدھا راستہ صرف ایک ہی ہوسکتا ہے کہ منشائے الٰہی معلوم کرسکنے کے لیے اپنی تمام قوتوں کو وقف کردیا جائے، نتیجہ درست نکلے یا نادرست ایک طرف تفسیر بالرائے کے گناہ سے محفوظ رہینگے اور دوسری طرف تلاشِ حق کی لذتوں سے آشنا۔ یہ ہی میرا مسلک ہے اور اس ہی کے تحت اپنا حقیقی نظریہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اس تاریخی واقعہ کے بارہ میں جو روایات ہیں اُن پر تنقید و تبصرہ کرنا بے نتیجہ ہوگا کیونکہ قرآن نے جس حد تک واقعہ بیان کیا ہے اُس پر اضافہ کرنے کے لیے جس تاریخی اور آثاری تحقیقات کی ضرورت ہے، وہ روایات سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ ان آیات کے جس قدر معنوی پہلو انسانی ذہن میں آسکتے ہیں اُن سب کی موافقت میں کوئی نہ کوئی روایت ضرور موجود ہے اور یہ چیز خود اس بات کی شہادت ہے کہ ان روایات کی کوئی مستند حیثیت نہیں۔ اس لیے اب جو پیچیدگیاں قابل بحث و نظر رہ جاتی ہیں وہ مفسرین کے دیانتدارانہ قیاسات ہیں اور بس۔

میں جہاں تک قیاس کرسکا ہوں معتزلہ اور اُن متکلمین کو نظر انداز کرتے ہوئے جو ماؤف ذہنیت کے آئینہ دار تھے صرف دو بنیادی نظریات قابل غور و بحث رہ جاتے ہیں ایک یہ کہ حضرت داؤدؑ کی اُمت پر جو غضب الٰہی تکوین، تحویل اور تسخیر کے ذریعہ ہوا وہ معنوی تھا یا صوری۔ تکوین صوری کا اثر تکوین معنوی پر اور تکوین معنوی کا اثر تکوین صوری پر ضرور مرتب ہوسکتا ہے اور ہوا ہوگا لیکن یہ ایک ضمنی چیز ہے اور اساسی نظریہ معنوی یا صوری انقلاب و تغیر ہی کہلایا جا سکتا ہے۔ مجاہدؒ جو معتبر مفسرین قرآن میں سے ہیں اُن کا قول ہے:-

مسخت قلوبھم ولم یمسخوا قردۃ وانما ہو مثل ضربہ اللہ لھم

ان کے قلوب مسخ ہوگئے تھے نہ کہ اُن کی صورت خدا نے اس مسخ کو مثال کے طور پر بیان کیا ہے۔

صاحب فتح البیان نے اس پر کوئی تنقید نہ کرتے ہوئے بتا دیا ہے کہ میرے نزدیک یہ کوئی ایسا خیال نہیں جس کو تسلیم ہی نہ کیا جا سکتا ہو۔ لیکن تفسیر ابن کثیر کے مصنف نے "قول غریب" اور "خلاف ظاہر" بتایا ہے حالانکہ اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ جس آیت کو بیان کرتے ہیں وہ خود اُن کی تائید میں کسی دوسری حقیقت کا انکشاف نہیں کرتی آیت یہ ہے۔

قُل ھل أنبئکم بشر من ذلک مثوبۃ کہہ دیجیے کیا ہم آگاہ کردیں اُس کے شر سے، باعتبار

عند الله من لعنه الله وغضب علیه — جزا، خدا کے نزدیک جس پر خدا نے لعنت بھیجی، اور غصہ

وجعل منهم القردة والخنازیر و — کیا، اور اس کے نتیجہ میں کر دیا انہیں بندر، سور اور

عبد الطاغوت[1] — باطل غلام -

سب سے پہلے قابل غور چیز یہ ہے کہ خدا نے جس شر کی طرف اشارہ کیا ہے وہ مثوبۃ عند اللہ" کے اعتبار سے ہے، دوسرے لعنت اور غضب الٰہی کے صوری اور جسمانی ہونے کی کوئی تصریح نہیں پائی جاتی - تیسرے "قردہ" "خنازیر" اور پرستاران طاغوت وباطل کو ایک ہی فہرست میں گنا بتاتا ہے کہ یہ تمام لعنت وغضب معنوی اور روحانی تھا لیکن اگر ہر ایک کو غضب الٰہی کی ایک مستقل نوع قرار دے دیا جائے تب بھی قردہ اور خنازیر ہو جانے سے کیا نئی چیز ثابت ہوئی؟ اس آیت اور کونوا قردۃ میں کونسا معنوی امتیاز تھا جس کے بھروسہ پر مجاہد کے قیاس عقلی اور وجدانی کو ٹھکرا دیا گیا - بہرحال مجاہد اُن حضرات میں سے ہیں جو مسخ معنوی کے قائل ہیں اور حضرت ابن عباسؓ

[1] اگر آپ اس انداز تحریر کو اُردو ادب کے محاورہ میں سمجھنا چاہتے ہیں تو اس طرح سمجھیے کہ خدا کے "وجعل منهم القردة والخنازیر وعبد الطاغوت" فرمانے کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ہم غصہ میں کہہ دیتے ہیں "گدھا، سور، نالائق" - اگرچہ ہمارے کہنے اور خدا کے کہنے میں عملی نتائج کے اعتبار سے فرق رہیگا اور رہنا چاہیے - جب ہمارا غصہ اور اُس کے محرکات بالکل مختلف ہوتے ہیں تو غایات میں کیوں فرق نہ ہو لیکن اصل راز دونوں جگہ یکساں ہے - ہم بھی ایک شخص کی اخلاقی، ذہنی اور عملی کمزوریوں پر برہم ہو کر اُن کمزوریوں کو اپنے تمثیلی علم کے مطابق جانوروں سے نسبت دیتے ہیں اور خدا نے بھی ایک ایسی ہی ادبی مگر واقعیت لیے ہوئے محاورہ کے تحت فرمایا ہے اور اپنے علم تمثیلی سے مشابہ - دوسرے جس طرح ہمارا آخری فقرہ پہلے فقروں کی بنیادی حقیقت کو واضح کرتا ہے مثلاً مذکورہ بالا محاورہ میں "گدھے اور سور" کے بعد "نالائق" کہنا - ایسے ہی خدا کا بندر اور خنزیر کے بعد عبد الطاغوت فرمانا اُس اساسی نظریہ کی ترجمانی کر رہا ہے جو پہلے فقروں کی روح ہے - نالائقی کے بھی مختلف پہلو ہو سکتے ہیں اور باطل پرستی کے بھی - پہلے فقرے ان پہلوؤں کی ایک گونہ تحلیل کرتے ہیں اور آخری فقرہ اُن سب کو ترکیب دے کر حقیقی معنی کو بے نقاب کرتا ہے حالانکہ وہ خود اپنی جگہ ایک تحلیل ہے - جن حضرات کو ادبی ذوق ہوگا وہ میری توضیحات کو تاویل کی تلخیوں سے آلودہ محسوس نہ کرسکینگے بلکہ اُن کو ایک ادبی لطف آئیگا جس کو وجدان ہی محسوس کر سکتا ہے - "ابو النظر رضوی"

اُن لوگوں کے نظریہ کی ترجمانی کرتے ہیں جو مسخ معنوی کے خلاف اور مسخ صوری کی تائید میں ہوں کیونکہ ایک طرف وہ اس کے قائل ہیں کہ بعد مسخ بھی اُنہوں نے بداعمالی جاری رکھی اور دوسری طرف بندروں کی صورت ہو جانے کے قائل ہیں لیکن قتادہ نے مسخ صوری کے ہراِبہام کو دور کرتے ہوئے "اذناب" پیدا ہو جانے تک کا تذکرہ کر دیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب بھی ایک گونہ مسخ معنوی کے ساتھ مسخ صوری کے قائل ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:-

"وظاہر است کہ در مسخ معنوی نیز تبدل بعضے از صفات نفسانیہ ضرور خواہد بود مثل تغیر ذکا بہ بلادت وتغیر قناعت بہ حرص وطہارت بہ خباثت وغیرہ ذلک" (صفحہ ۲۷۷)

بلکہ مسخ صوری سے انکار کرنے والوں پر ناراضگی کا بھی اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"ونزد عقل در تغیر صفات نفسانیہ وصفات محسوسہ فرقے نیست وایں را باور داشتن وآں را انکار نمودن خالی از اثر تسم معنوی نیست"

حالانکہ ان دونوں میں ایک نازک فرق تھا یعنی سنت الٰہی کی موافقت وعدم موافقت، جہاں تک انسانی مشاہدات قوانین فطرت کا مطالعہ کر چکے ہیں مسخ صوری کی اس نوعیت کا کہ آدمی کے بندر کی دُم پیدا ہو جائے یقین نہیں دلاتے خواہ تحت قدرت ہی کیوں نہ ہو کسی چیز کا ممکن ہونا اور وقوع پذیر ہونا یکساں حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے تعجب ہے کہ شاہ صاحب نے معجزات کے بارے میں قرآن کی نظریہ کا مطالعہ نہیں فرمایا، ورنہ وہ ہرگز عذابِ الٰہی کے بارے میں اُن لوگوں پر جو معتزلانہ ذہنیت کے تحت نہیں بلکہ سنجیدہ تحقیقات کے ذریعہ عذاب الٰہی کو قوانین فطرت اور اس کے مسلسل مشاہدات کی روشنی ہی میں دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں، مسخ معنوی کا شبہ نہ کرتے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ معجزات "ناممکن عجائبات" کی ایک قسم ہیں۔ قوانین فطرت کی کارکردگی کو اُس میں کوئی دخل نہیں لیکن قرآن جو حقائق کا پیغامبر ہے اس غلط نظریہ کی تائید نہیں کرتا اور کہتا ہے:-

فلما جاءھم بآیٰتنا اذا ھم منھا | جب کبھی ہم اپنی نشانیاں دکھاتے وہ دیکھتے
یضحکون ما نریھم من اٰیۃ الّا ھی | ہی ہنسنے لگتے کیونکہ ہم نے جتنی نشانیاں بھی دکھائیں
اکبر من اُختھا (سورۂ زخرف) | وہ جادو کی بڑی بہن تھیں۔

فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے دعویٰ کیا تھا کہ آپ کے جادو کے "مثل" ہی میں بھی اپنے جادو کی نمائش کرکے دکھاؤنگا لیکن قرآن نے مثل نہیں بلکہ "اُخت" فرمایا "مثل" کی صورت میں دونوں کا منبع اور ماخذ ایک ہی قوت نہیں ہوا کرتی اور یہاں دونوں کا مرکز ایک ہی قوت متخیلہ اور ارادیہ تھی۔ اس لیے "اُخت" ہی کی اصطلاح زیادہ موزوں ہوسکتی تھی تاکہ دونوں کی پیدائش ایک ہی ماں کے شکم سے ثابت ہوسکے۔ فرق ضعف و قوت اور کہتری و مہتری کا تھا نہ کہ مرکز اور ماخذ کا۔ فرعون اور اُس کے جادوگروں کی قوت متخیلہ میں شدید سے شدید ریاضت و مجاہدہ اور گوناگوں اعمال سے جو فاعلانہ اور ایجابی قوت پیدا ہوئی وہ انسان کے ارتقاء عملی کا جادو تھا اور حضرت موسیٰ نے بغیر مجاہدہ اور مشق کے جو عظیم ترین قوت جذب کی وہ وہبی اور الٰہی قوت تھی اس لیے انسان کا کسب کمال ایک پیغمبر کے معجزہ تک نہ پہنچ سکا۔ جادوگروں کا کمال دیکھ کر حضرت موسیٰؑ کا دل ہی دل میں ڈرنا دو باتوں کو صاف کردیتا ہے، ایک یہ کہ انسان مشق و مزاولت سے جتنا حیرت انگیز کمال پیدا کرسکتا ہے وہ جادوگروں میں موجود تھا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ باوجود پیغمبرانہ عزم و یقین کے اپنی کامیابی کی طرف سے ایک گونہ بدظن ہونے لگے، اور دوسرے یہی خوف اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اُن کا معجزہ اُن کی کسی استعداد سے وابستہ نہ تھا۔ خدا نے جب تک اُن کو کامیابی کا یقین دلاتے ہوئے معجزہ دکھانے کا حکم نہیں دے دیا وہ اپنی انسانی کمزوریوں کے احساس کی بنا پر خوف کرتے رہے۔

یہاں پر مجھے ایک صاحب کا قول یاد آگیا جو کسی مضمون میں دیکھا تھا، کہ اگر حضرتِ موسیٰؑ

جادوگروں کی قوت متخیلہ کا اندازہ نہ کرچکے ہوتے تو اُن سے بہتر معجزہ نہ دکھا سکتے تھے۔ قوت متخیلہ قوت متخیلہ سے قوت حاصل کرتی ہے۔ یہ مغالطہ ہے اور سخت مغالطہ۔ اگر حضرت موسیٰؑ کی قوت متخیلہ کا معجزہ کسبی استعداد پر مبنی ہوتا اور اتفاقی طور پر کامیابی ہوگئی ہوتی تو اُن جادوگروں کو یقیناً احساس ہوجانا چاہیے تھا جن کی عمریں اسی شغلہ میں گذری تھیں۔ اُن کا سجدہ میں گرتے ہوئے "امنّا برب ھارون وموسیٰ" کہہ دینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ساحروں کو یقین ہوگیا تھا کہ اتنی معجزانہ قوت اکتساب ومشق سے نہیں پیدا ہوسکتی اور یہ شخص یقیناً مافوق الفطرت قوتوں سے ممتاز ہے۔

حضرتِ موسیٰؑ کا معجزہ یقیناً انسانی طاقت سے باہر تھا، اور اس لیے اُس کو صحیح معنی میں معجزہ کہہ سکتے ہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ خدا کی قوت کا مظاہرہ اُسی قوتِ متخیلہ کو قوی تر کرنے کے ذریعہ کیا گیا تھا جو ہر انسان میں آپ دیکھ سکتے ہیں، اور اسی حقیقت کی طرف قرآن نے "من اُختھا" سے اشارہ کیا ہے۔ اب میں دریافت کرتا ہوں کہ اگر معجزات جو اُسی طرح آیاتِ الٰہی کی فہرست میں داخل ہیں جس طرح عقوباتِ الٰہیہ، تو عقوباتِ الٰہیہ کے لیے قانونِ فطرت ہی کی کوئی دفعہ تلاش کرنا، کیونکر گناہ ہوسکتا ہے، میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ روایات اپنی جگہ صحیح ہوسکتی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ ممسوخین ایک مکان میں مسخ ہوکر زندہ رہے اور پھر مر گئے۔ یہ مسخ حقیقی تھا یا مثالی اس کا فیصلہ خدا ہی کرسکتا ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ ہمارے اور خود اُن لوگوں کے تخئیلی اعتبار سے جو عذاب میں مبتلا ہوئے مسخ ہی ہوگیا ہو، اور شدید احساس رنج وغم کے تحت وہ چند روز سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے ہوں۔ یہ پہلو ایک طرف قانونِ فطرت سے بھی ہمیں باہر جانے پر مجبور نہیں کرتا، اور دوسری طرف ایک زندہ طاقت کی زندہ گرفت کا بھی ثبوت ہوگا لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب کی طرح صرف اتنا بتا دینا میرے نزدیک قطعاً ناکافی ہے کہ اگر مسخ معنوی ہوسکتا ہے تو مسخ صوری بھی کیوں نہ تسلیم کرلیا جائے۔ انسانی علم وتحقیق ایک چیز کو قانونِ قدرت کا جزء سمجھتی ہے

اور دوسری کو نہیں۔ ایسی حالت میں دونوں کو ایک ہی سطح پر کس طرح رکھا جا سکتا تھا، مسخ معنوی کا اثر اُن ذہنیات کے لیے تسلیم کیا جا سکتا ہے جو کفر و تمرد کی نیت سے کوئی تاویل کر رہے ہوں، ورنہ تاریخی واقعات کو تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرنا کوئی اخلاقی جرم نہیں۔

اس تمہید کے بعد میں چاہتا ہوں کہ اپنا نظریہ بھی خلوص و دیانت کی برکات سے محرومی گوارا نہ کرتے ہوئے علماء مذہب کے سامنے تنقید و تبصرہ کے لیے پیش کر دوں۔ میرا شعور اور وجدان تلاش و تحقیق کی جن وادیوں کو طے کر چکا ہے اُس کے اعتبار سے مجھے یہ کہنے کا حق ہونا چاہیے کہ اگرچہ قرآن نے مسخ کو "مثال" کے طور پر نہیں بیان کیا جیسا کہ "مجاہد" کا گمان ہے، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ دراصل مسخ معنوی قسم کا تھا اور اخلاقی خصائص و امتیازات جس حد تک انسانی حرکات و سکنات کو ملکوتی یا بہیمانہ بنا سکتے ہیں اُس کے تاثرات سے تردامن متمدن اور وحشی انسان میں اگرچہ انسانی استعداد کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن حیاتِ اجتماعی کے تمدنی قوانین و اخلاق کا خوگر انسان کہلاتا ہے اور ناواقف ایک جانور یا درندہ۔ جو بچے اتفاقی حوادث سے بعض درندوں کے درمیان زندگی بسر کر چکے ہیں اُن میں انسانیت کا کوئی شائبہ نہیں رہتا حتیٰ کہ تمام حرکات و سکنات بلکہ بعض اوقات ساخت تک میں ایک گونہ تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ یورپ کے ماہرین طب اس خدشہ کا کیوں اظہار کر رہے ہیں کہ کہیں مرد، عورتوں کی شکل و صورت اختیار نہ کر لیں اور عورتیں مرد کی۔ وجہ صرف یہی ہے کہ خیالات و اعمال آئندہ نسل پر بھی اثر انداز ہوتے اور انہیں خیالات و اعمال کے سانچہ میں ڈھال دیتے ہیں جو آباء و اجداد نے اختراع کر لیے تھے۔

آپ نے سنا ہو گا کہ ہندوستانی جنگ آزادی کی پہلی کوشش یعنی غدر ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد تک انگریزوں کو بندر کہا کرتے تھے، کیوں؟ اس لیے کہ اُن کے نزدیک انگریزوں کا نہ کوئی روحانی تمدن تھا نہ مادّی۔ صورت کے اعتبار سے وہ ہندوستانیوں کی بہ نسبت خوش قطع نہ سہی

خوش رنگ ضرور ہوتے تھے، مگر اس کے باوجود اُن کو تسلط و اقتدار اور مادّی تمدن میں ارتقاء کے بغیر انسانی وقار نصیب نہ ہوسکا۔ بندر خواہ انسانی ساخت کی پہلی کڑی ہوں یا فلاسفۂ قدیم کے بعض نظریات ارتقاء کے مطابق انسان کی احسن تقویم بندروں کی پیدائش کے بعد کائنات میں اپنی جگہ حاصل کرسکی ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان اگر انسانیت سے فروتر اور پست ہوتا چلا جائے تو سب سے پہلے اُسے بندر ہونا پڑیگا اور اس کے بعد کچھ اور۔ بندر انسان کی طبعی جنگ آج تک زندہ ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی میونسپلٹی ہو جو بندروں کی غارتگری اور نقصان رسانی سے محفوظ رہنے کے لیے "بندروں کی لعنت" کو شہر سے دور کرنا نہ چاہتی ہو۔ سارے جانوروں میں ایک بندر ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ جب اُس کو شہری زندگی سے محروم کرنے کے لیے مطالبہ کیا جائیگا تو بندروں کی "لعنت" کہتے ہوئے۔ بندر اپنی جگہ پر ساخت کے اعتبار سے "خاسئین" میں داخل نہیں بلکہ شرف انسانی سے قریب تر ہے، صرف اُس کے خصائل اور عادات نے اُسے لعنت بنا دیا۔ یہ نکتہ اگر آپ کے ذہن نشین ہوگیا ہو تو آپ اطمینانِ قلب کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کرسکینگے کہ لعنت خصائل، عادات اور اطوار سے پیدا ہوتی ہے یا ہیاکل اور تشخصات سے اسلام تناسخ کا قائل نہیں۔ اُس کے نزدیک کوئی حیوانی شکل تناسخ کا نتیجہ نہیں ہوسکتی، نہ کسی جانور کو محض اُس کی ہیئت اور ساخت کے تغیر و اختلاف کی بنیادوں پر خیر و شر کے اضافات سے وابستہ کرنے کی اجازت قدرت نے مصالح کے تحت ہر چیز اپنی جگہ مناسب اور خوبصورت اور ضروری تیار کی ہے، کسی کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں۔ اگر خیر و شر کا تعلق حسنِ صورت سے ہوتا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ دعوت اسلام وحق کے موذن نہ قرار پاسکتے تھے، خدا نے قردہ اور خنازیر بنانے کو شر سے تعبیر کیا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ شر کا کوئی رابطہ جسم اور جسمانیات سے نہیں۔ شر روح کی ایک تاریکی ہے جس کا اثر خصائل و عادات پر خصوصاً اور ساخت پر عموماً پڑسکتا ہے۔ براہِ راست جسم کی ساخت میں کوئی تبدیلی شر کی اثراندازیوں سے نہیں ہوا کرتی۔

لہ جدید ترین تحقیقات نے دوبارہ ڈارون کی تحقیق کو مغالطہ ثابت کردیا اور فلاسفہ قدیم کی ذہنی عظمت کو تسلیم کرلیا ہے۔ ابو النظر رضوی

لیکن ساخت میں تغیر ہو سکنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے کہ دُم لٹکنے لگے یا ہاتھی کی سونڈ نکل آئے قدرت نے ہر فعل وانفعال، ہر اثبات ونفی اور ہر خیر وشر کا ایک قانون مقرر کر دیا ہے، اُس کے خلاف ہو سکتا ہے مگر ہوتا نہیں۔

دوسرے، خدا نے جن اقوام واُمم کو لعنت اور غضب میں گرفتار کر کے آیات الٰہی میں داخل کیا ہے، اُن کا چند لمحات میں مسخ ہو کر چند روز کے اندر مرجانا نہایت محدود، مشتبہ اور غور طلب مسئلہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ شاہ عبدالعزیز صاحب جیسے مسخ صوری کے قائل کو بھی دور از کار تاویلات میں اُلجھنا پڑا فرماتے ہیں:۔

"وتکوین وایجاد ایں صفات در ایشاں بایں نوع صورت گرفت کہ ہماں گوشت ماہیان در شکم ایشاں فاسد شدہ مادۂ خبیثہ جذام گردید ویک بار جلد ایشاں مندفع شدہ پوست ایشاں شکل پوست بوزنہا گرفت و در پشت ہائے ایشاں خمے حدیاب ظہور نمودہ رنگ او سوختہ گردید وموئہائے اصلی ایشاں تساقط پذیرفت وشکل چہرہ متغیر شد چنانچہ در غلبۂ جذام می شود وبایں ہمہ قدرت نطق ہم از ایشاں زائل گشت وفہم وشعور انسانی بجا ماند باہم می نگریستند ومی گریستند خاسئین یعنی مہان ومحقر بسبب تعفین خلط اکال در آنہا و برآمدن بوئے بد از ابدان آنہا..."

(صفحہ ۲۷۴ تا ۲۷۵)

شاہ صاحب کی یہ تاویل اگر موجب اجر وثواب ہو سکتی ہے تو نیک نیتی کے ساتھ کوئی تاویل آخر کس دلیل سے ناجائز قرار دی جائیگی۔ جذام سے بوزنگی کا کیا امکان ہے؟ نہ جذامی اور بوزنہ کی جلد ہم رنگ ہوتی ہے، نہ بوزنہ کی جلد بدبودار، نہ جذام خمِ پشت پیدا کرتا ہے، نہ بوزنہ کی پشت صحیح معنی میں خمیدگی رکھتی ہے اور اگر کسی قسم کی خمیدگی تسلیم کرلی جائے تو وہ ایک جذامی کی خمیدگی پشت سے بہر نوع مختلف ہوگی، پھر "خاسئین" کی تفسیر "تعفن، خلط اکال" سے کرنا آخر کیا معنوی نسبت رکھتا ہے، اور

کیا اس تفسیر کو شعور و وجدان کی طمانیت کے لیے کافی خیال کیا جا سکتا ہے۔کسی سنجیدہ تاویل کو خواہ وہ قوائے فکریہ کے اضمحلال کا ہی نتیجہ کیوں نہ ہو اس درجہ پست حیثیت سپرد کر دینا سخت گیرانہ نکتہ چینی کا ایک دردناک پہلو ہے جس سے احتراز ہی بہتر۔یہاں یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ جذام کے ذریعہ مسخ صوری خود ایک قانونِ قدرت ہے اور بوزنگی کو جذام کا نتیجہ بتانے والا غیر محسوس طور پر اُس طبعی تقاضہ کے اشارہ پر قلم کو جنبش دے رہا ہے جو مسخ معنوی کی تاویل کرنے والے کے دل میں کھٹک رہا تھا۔تاویل کے محرکات دونوں جگہ یکساں ہیں بنا بر ایں نتائج کے اختلاف کو ذہنی استعداد کے تفاوت سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔یہ سب کچھ کیوں کرنا پڑا، اس لیے کہ آیت الٰہی کو محدود کر دیا گیا تھا۔آیات الٰہی کا تسلسل شاید پچھلی صدیوں کے مفسرین کی تخیلی قوتوں کو ناممکن محسوس ہوا اس چیز نے باوجود اس کے کہ قرآن "مابین یدیہا وما خلفہا" کے ذریعہ آیت الٰہی کے مسلسل ہونے کا دعویٰ کر رہا تھا، محدود کرنے پر مجبور کر دیا۔

یحییٰ بن یحییٰ اندلسی

(از مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی لکچرار ورنگل کالج دکن)

اندلس (ہسپانیہ) جو مسلمانوں کی تمناؤں اور اُمیدوں کا مرقد ہے۔ اور جس کی یاد آج بھی مسلمانانِ عالم کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ وہ مقام ہے جہاں سے اہل یورپ نے علومِ جدیدہ کی ابجد سیکھی تھی۔ جس طرح آج اہل مشرق یورپ کی درسگاہوں میں علوم وفنون کی تحصیل و تعلیم کے لیے جاتے ہیں۔ اس وقت جب یورپ جہالت کی تاریکی میں گھرا ہوا تھا اہل یورپ اندلس کا سفر کرکے علم حاصل کرتے تھے، چنانچہ مسلمانوں کا اہل یورپ کی گردن پر جو احسان ہے اُس کا اقرار بہت سے مستشرقین کر چکے ہیں۔

"بنی اُمیہ کی حکومت سے پہلے سنہ ۹۲ھ میں ہسپانیہ علوم وفنون سے بالکل خالی تھا، تمام ملک میں ایک ہستی بھی ایسی نہ تھی جو کسی علم وفن میں مشہور و معروف ہو، ہر طرف جہالت و وحشت کا دور دورہ تھا، سوائے اُن قدیم طلسمات کے جن کو روم کے بادشاہوں نے بطور یادگار یا آثار قدیمہ کے چھوڑا تھا، ملک بھر میں کوئی غیر معمولی تعمیر تک نہ تھی"[1]

اندلس میں علوم وفنون کی ابتدا بنی اُمیہ کی حکومت کے ساتھ ہوئی ہے۔ تقریبًا چھیالیس[46] برس تک خلفاءِ بنی اُمیہ اپنے گورنروں کے ذریعہ حکومت کرتے رہے۔ اس وقت دمشق دارالخلافہ تھا، اور اندلس اُس کا ایک صوبہ۔

---

[1] غابر الاندلس وحاضرہا، مولفہ کرد علی رئیس مجمع علمی۔ مطبوعہ مصر ص۵۳

"لیکن جب عباسیوں کا زور ہوا اور ہر جگہ بنی اُمیہ قتل و غارت کیے گئے۔ بنی اُمیّہ کے بقیۃ السیف (بچے ہوئے) لوگوں میں سے عبدالرحمٰن اوّل خلیفہ ہشام کا پوتا بھی تھا، یہ کئی سال تک سرگرداں پھرتا رہا۔ جب اُس کی نظر ہسپانیہ پر پڑی اور دیکھا کہ وہاں بے شمار خانہ جنگیاں اور باہمی لڑائیاں ہو رہی ہیں تو اس نے اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہا، ہسپانیہ اُس وقت رشک و حسد کی آگ میں جل رہا تھا۔ اہل بربر (افریقہ) اور عربی اقوام میں بے حد تعصب پیدا ہو گیا تھا۔ عبدالرحمٰن بقول بعض مورخین کے شکرے اور باز کی طرح ہسپانیہ جا پہنچا۔ اور جب اُس نے اپنے آپ کو بادشاہت کے لیے پیش کیا تو امراءِ ہسپانیہ نے اس کا خیر مقدم کیا[1]۔

غرض عبدالرحمٰن ۱۳۵ھ ۷۵۵ء کے ختم پر جو عباسی خلیفہ منصور کا زمانہ تھا اندلسیہ میں وارد ہوا، اور دوسرے سال ۱۳۸ھ ۷۵۶ء میں ہسپانیہ کے نامور مسلمانوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی، اور عبدالرحمٰن عباسیوں کی فوج کو شکست دے کر ہسپانیہ پر قابض ہو گیا۔ عبدالرحمٰن اوّل کے بعد ہشام پھر حکم اوّل علی الترتیب ہسپانیہ پر حکومت کرتے رہے۔" ۲۰۲ھ ۸۲۲ء سے عبدالرحمٰن ثانی کی حکومت کے زمانہ میں دراصل اندلس میں علم و فضل کی ابتدا ہوئی۔ پھر ۲۳۸ھ ۸۵۲ء میں محمد اوّل کے زمانہ میں بہت سی لوگوں نے علوم عقلیہ فلسفہ وغیرہ میں مہارت حاصل کی۔ غرض دوسری صدی کے بعد اندلس میں بڑے بڑے مشاہیر علماء پیدا ہو چکے تھے[2]" اسی زمانہ کے مشاہیر میں یحییٰ بن یحییٰ ہیں۔

یحییٰ بن یحییٰ کا طلبِ علم کے لیے سفر

یحییٰ بن یحییٰ کو مورخین بربر (افریقہ) کے لوگوں میں سے لکھتے ہیں جنہوں نے اندلس ہی کو وطن بنا لیا تھا۔

اٹھائیس برس کی عمر میں انہوں نے علم دین حاصل کرنے کے لیے مدینہ منورہ کا سفر کیا، اس وقت مدینہ علوم دینیہ اور اخلاق کا مرکز تھا، بڑے بڑے علماء اور اتقیاء اپنے اپنے حلقۂ درس سے فیض

[1] مورخ نوفل آفندی (بیروت)، [2] کرد علی رئیس مجمع علمی، بیروت